فہمِ قرآن

(۶)

کیا قرآن مجید بغیر سُنت کے سمجھ میں آسکتا ہے؟

ہندوستان میں اب ایسے حضرات کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے جو مطالب قرآنی کے صحیح فہم کے لیے احادیث کے علم کو شرط قرار نہیں دیتے۔ اُن کی رائے میں احادیث ناقابل اعتبار روا ستناد ہیں اور اس بنا پر اُن میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ تشریع احکام یا تفسیر قرآن میں اُن سے مدد لی جا سکے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس خاص مسئلہ پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ کلام کیا جائے۔

سُنت سے احتجاج کا انکار ہمارے دورِ نامسعود کی ہی خصوصیت نہیں، بلکہ اس سے قبل بھی کچھ لوگ تھے جو سُنت کو قابل احتجاج تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی نے نویں صدی ہجری کے آخر میں "مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة" کے نام سے ایک رسالہ اسی طرح کے ایک منکر حدیث کے رد میں تصنیف فرمایا تھا جو مصر سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن زمانہ کے اوصاف و اطوار کے اختلاف کی وجہ سے ہمارے عہد میں اور اُس عہد میں فرق یہ ہے کہ زمانہ گزشتہ میں چونکہ ایمان کامل اور عقائد پختہ اور تمسک بالشریعت کا جذبہ مستحکم تھا، اس لیے منکر حدیث پر گوشۂ عافیت تنگ ہو جاتا تھا۔ اُس کی صدا صدا بہ صحرا ہو کر گمنامی و عدم قبول کی فضاؤں میں گم ہو جاتی تھی اور عام مسلمانوں میں اُس کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا لیکن آج ہمارے زمانہ میں حالات یہ نہیں ہیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر ڈنکے کی چوٹ احادیث نبوی کا انکار کرتا ہے، اُن کی تشریعی احکامی

حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ معاذ اللہ کُتبِ حدیث کو "جھوٹ کے موّاج دریا" کہتا ہے، اُن کا استہزا اور تمسخر کرتا ہے، سگرٹ کے پف ہوا میں اُڑاتے اور اپنے ہونٹوں کو ایک اعوجاجی جنبش دیتے ہوئے اُن پر پھبتیاں کستا ہے۔ اس کے باوجود اُس کو لوگ عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اُس کے مضامین کو رسالوں میں جگہ دی جاتی ہے، اور اُس کو "مجدد ملت" "محیی شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ "وائے گردشِ امروز بود فردائے"۔ دین میں مداہنت اور شریعت کی پابندیوں میں تساہل برتنے والی طبیعتیں اُس کی آواز پر لبیک کہتی ہیں۔ اور اس طرح وہ چند برگشتہ دماغ نوجوانوں کا ایک حلقہ تیار کر لیتا ہے۔

قرآن میں اتباعِ رسول کا حکم

ان حضرات سے خود ان کے عقیدہ کے مطابق پہلی بات یہ دریافت کرنی چاہیے کہ قرآن مجید کو تو آپ قابل استناد اور اُس کے احکام کو واجب الاتباع مانتے ہی ہیں۔ اب یہ ارشاد ہو کہ اس باب میں قرآن کے ایک ایک لفظ ایک ایک آیت سب برابر ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے۔ نیز یہ کہ قرآن مجید میں جو اوامر و احکام ارشاد فرمائے گئے ہیں اُن میں کیا بعض احکام ایسے بھی ہیں جن کا مصداق خارج میں موجود نہیں؟ اگر یہ فرمایا جائے کہ قرآن کی تمام آیات کا خارج میں مصداق موجود ہے۔ اور وہ سب ہمارے لیے ضروری الاتباع ہیں، تو پھر اُن آیات کی نسبت کیا کہا جائیگا جن میں صاف طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے نقشِ قدم پر چلنے اور آپ کے اقوال و افعال پر عمل کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ مثلاً آیاتِ ذیل

(۱) فآمنوا باللہ و برسولہ — ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر

(۲) انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ و رسولہ — مومن صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "ایمان بالرسل" کے معنیٰ کیا صرف یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

ونبوت کا اقرار کرلیا جائے۔ اور آپ کے اقوال و افعال سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اگر ایمان بالرسول کے معنیٰ صرف یہی ہیں تو ایمان باللہ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں کہ اللہ کی وحدت اور اُس کی ربوبیت کا اقرار کرلیا جائے اور اُس کے اوامر و نواہی کی پروانہ کی جائے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو اسلام کے ساتھ دور کا بھی لگاؤ ہے وہ ایمان باللہ و بالرسول کے یہ معنیٰ ہرگز مراد نہیں لے سکتا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو واحد و رب مطلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیِ برحق یقین کرکے دونوں کے اوامر و نواہی پر عمل پیرا ہونے کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ ورنہ اگر ایمان بالرسول سے صرف آپ کی رسالت کا اقرار کرنا مقصود ہوتا تو پھر آپ میں اور دوسرے انبیا میں فرق کیا ہے؟ اُن کی نبوت کا اقرار کرنا بھی تو آخر جزء ایمان ہی تو ہے پس جس طرح ایمان باللہ کے معنیٰ عمل بالقرآن کا عہد کرنا ہے، ٹھیک اسی طرح ایمان بالرسول کے معنیٰ سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کا عہد ہوگا۔ اب اگر سُنت قابل احتجاج و استناد ہی نہیں ہے تو پھر ایمان بالرسول کی حقیقت کس طرح متحقق ہوگی۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن مجید پر عمل کرنا ہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا ہے تو معلوم نہیں اُس آیت کا کیا جواب دیا جائیگا جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان جتاتے ہوئے صاف طور پر فرمادیا ہے کہ رسول اللہ تمہارے پاس کتاب (قرآن مجید) اور حکمت لے کر آئے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ علی المومنین اذ	اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ اُس نے
بعث فیھم رسولا من انفسھم	خود اُنہی میں سے ایک رسول پیدا کیا جو اُن
یتلوا علیھم اٰیٰتہٖ ویزکیھم ویعلمھم	پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اُن کا
الکتاب والحکمۃ وان کانوا من	تزکیہ کرتا ہے۔ اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم
قبل لفی ضلالٍ مُّبین	دیتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے سے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

"یہ حکمت کیا بعینہٖ کتاب ہے؟ اور کیا "حکمت" کا عطف "کتاب" پر عطف بیان ہی ہے؟ ارباب بلاغت جانتے ہیں کہ یہاں موقع عطفِ بیان کا ہے ہی نہیں، کیونکہ یہاں احسان جتایا جارہا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد اوصاف کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اگر کتاب اور حکمت سے ایک ہی چیز مراد لی جائے تو آنحضرتؐ کے اوصاف میں ایک کی کمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں "میں نے اُن بزرگ سے جو اہل علم ہیں مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، سُنا ہے کہ اس آیت میں کتاب سے مُراد قرآن مجید اور حکمت سے مراد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے" پس اگر حکمت سے مُراد غیر کتاب اللہ کوئی دوسری چیز ہے اور از روئے بلاغت حکمت سے کتاب اللہ مُراد ہو ہی نہیں سکتی تو بتایا جائے وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟ اور کیا وہ اقوال و افعال نبوی کے سوا کوئی دوسری چیز ہو سکتی ہے؟

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے :۔

یاایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ	اے ایمان والو تم اطاعت کرو اللہ کی اور
واطیعوا الرسول واولی الامر	اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے
منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ	اولی الامر کی۔ اور اگر کسی بات میں جھگڑ بیٹھو
الی اللہ والرسول	تو اُس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔

اس آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کے لیے الگ الگ صیغہ "اطیعوا" لایا گیا ہے، لیکن "اولی الامر" کے لیے الگ کوئی صیغہ نہیں لایا گیا۔ بلکہ اس کو صرف "رسول" پر معطوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں کیا خاص نکتہ ہے؟ ہو سکتا تھا کہ صرف ایک "اطیعوا" بصیغہ امر لایا جاتا اور رسول اور اولی الامر دونوں کو اللہ پر معطوف کر دیا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ تینوں کے لیے الگ الگ تین صیغے "اطیعوا" کے لائے جاتے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان دونوں

صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار نہیں فرمایا گیا اور اللہ اور اس کے رسول کے لیے تو جُدا جُدا "اُطیعوا" ارشاد ہوا "اولی الامر" کے لیے نہیں۔ اس میں نکتۂ بلیغ یہ ہے کہ قرآن مجید کو اصل میں دو مجموعہ قوانین کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ایک وہ جو اللہ کی طرف منسوب ہو کر "کتاب اللہ" اور دوسرا وہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو کر سنتِ "رسول اللہ" کہلاتا ہے اور چونکہ اولی الامر ان سے مُراد حکام و ولاۃ ہوں یا علماء و مجتہدین) کی اطاعت کے لیے الگ کوئی مجموعۂ قوانین نہیں ہے بلکہ اُن کی اطاعت کے احکام وہی ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہیں اس بنا پر اُن کے لیے الگ صیغۂ "اطیعوا" نہیں فرمایا گیا۔ چنانچہ آیت کا اخیر حصّہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ اگر تم آپس میں جھگڑا کرو ـــ تم میں حاکم اور محکوم دونوں شامل ہیں ـــ تو اُس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ مطلب یہ ہے کہ اُن سے فیصلہ طلب کرو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہمارے لیے قابلِ احتجاج دو چیزیں ہیں ایک اللہ کا فرمان، اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد۔ اگر صرف اللہ کا فرمان یعنی "وحی متلو" ہی لائق استناد ہوتا تو "الرسول" فرمانے کی کیا وجہ ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ درحقیقت رسول کا فرمان بھی اللہ کا ہی فرمان ہے۔ تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اللہ کے ساتھ رسول کے ذکر کا سبب کیا ہے؟ پھر دیکھیے اس سے بھی زیادہ واضح طریقہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور آپ کے ارشاداتِ گرامی پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى	تیرے رب کی قسم یہ لوگ اُس وقت تک مومن
يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا	نہیں ہونگے جب تک کہ یہ اپنے اختلافات میں
يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا	آپ کو حکم نہیں بنائینگے اور پھر اس کے بعد
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔	آپ کے حکم سے متعلق وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی

اس آیت سے یہ امر بالکل منقح ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی جن کے قبول کرنے اور ماننے پر ایمان کا دار ومدار کیا جارہا ہے، صرف وہی نہیں ہیں جن کو "وحی متلو" یا قرآن کہا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ آپ کے اور ارشادات بھی ہیں جن پر لفظ "سُنت" کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور وہ بھی واجب التسلیم ہیں اور اُن کے مانے بغیر کسی کا ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔

اس موقع پر یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ منکرین حدیث میں بعض لوگ ہیں جو حدیث کی تاریخی حیثیت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اُس کو تشریع احکام میں موثر نہیں مانتے۔ آیت مذکورۂ بالا سے ان لوگوں کی بین طور پر تردید ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر "سُنت" کی حیثیت محض تاریخی ہے تشریعی نہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحکیم اور آپ کے فیصلہ کا واجب الطاعۃ ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر کس تاکید سے فرمایا گیا ہے کہ "تیرے رب کی قسم یہ مومن ہی نہیں ہونگے جب تک کہ آپ کے فیصلہ کو بغیر کسی بددلی کے پورے طور پر تسلیم نہیں کرلینگے"۔

اب دریافت طلب یہ ہے کہ یہ حکم آج بھی موجود ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے اور صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تک کے لیے تھا تو چونکہ آپ کی حیات میں وحی برابر نازل ہوتی رہتی تھی اور جو بات اہم پیش آتی تھی اُس کا جواب قرآن سے ملجاتا تھا۔ اس لیے اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ آپ کو حکم بنانے اور آپ کے ارشاد سامی کو تسلیم کرنے کا حکم دیا جاتا لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ "ردوہ الی اللہ والرسول" اور آنحضرت کے فیصلہ کو بے چون وچرا تسلیم کرنے کا حکم آج بھی ایسا ہی موجود ہے جیسا کہ آپ کے عہد میں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سُنت کا تمام ذخیرہ (معاذ اللہ) ناقابل احتجاج ہے تو پھر "قضاء رسول" کو ادنی پس وپیش کے بغیر تسلیم کرنے اور اُس پر عمل کرنے کی صورت کیا ہے؟ اور نزاع برپا ہونے کے وقت رد الی اللہ کے ساتھ رد الی الرسول کیونکر ممکن ہے؟ جو "محققین" و "مجددین" حدیث کو محض ایک تاریخی حیثیت دیتے

ہیں اُنہیں آیت ذیل بہ غور و تعمق پڑھنی چاہیے۔

لاتجعلوا دعاءَ الرسول بینکم — تم رسول کے بُلانے کو ایسا مت سمجھو جیسا کہ تم

کدعاءِ بعضکم بعضا قد یعلم اللّٰہُ — میں کا ایک دوسرے کو بلا لیتا ہے۔ بلاشبہ

الذین یتسللون منکم لواذاً — اللہ تعالیٰ تم میں سے اُن لوگوں کو جانتا ہے

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ — جو کترا کر نکل جاتے ہیں وہ لوگ جو رسول کے

ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم — امر سے اعراض کرتے ہیں اُن کو ڈرنا چاہیے کہ

عذابٌ الیمٌ ۔ — کہیں اُنہیں کوئی فتنہ یا عذاب الیم نہ پہنچ جائے

آپ نے دیکھا! اس آیت میں کس وضاحت کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ کا ارشاد عام لوگوں کی بات چیت یا اُن کے ملفوظات کی طرح نہیں ہے کہ اُن سے محض تاریخ کا کام لیا جائے۔ بلکہ وہ واجب الاتباع ہے اور یخالفون کے صلہ میں "عن" واقع ہو رہا ہے۔ اس لیے معنیٰ یہ ہوئے کہ جو لوگ امر رسول سے کترا کر نکل جاتے ہیں اُن کو فتنہ یا شر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ کہاں حدیث کی محض تاریخی حیثیت اور کہاں یہ تاکید اکید۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا!

ایک دوسری آیت ہے:-

وانزلنا الیك الذکر لتبین — اور اُتاری ہم نے تجھ پر یہ یاد داشت تاکہ تو

للناس ما نزل الیھم — کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز

جو اُتری اُن کے لیے۔

یہاں "یاد داشت" سے مراد قرآن مجید ہے جو امم سابقہ کے شرائع و احوال کا محافظ انبیائے سابقین کے علوم کا جامع اور احکام الٰہی اور فلاح دارین کے طریقوں کو یاد دلانے والا ہے۔ اس

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے۔ حضور! آپ کا کام یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لیے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کھول کر بیان فرمائیں جو چیز قابل تشریح ہے اُس کی تشریح فرما دیں جو مجمل ہے اُس کی تفصیل کردیں۔ یہ آیت اس حقیقت پر دلیل قاطع ہے کہ آیات قرآنی کا وہی مطلب قابل اعتبار ہے جو حضور کی بیان فرمودہ حدیثوں کے مطابق ہو۔

اِن آیات بنیات کے ماسوا ایک اور آیت ہے :-

وما آتٰکم الرسول فخذوہ و	جو چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیں
ما نھٰکم عنہ فانتھوا	اُس کو لے لو اور جس سے روکیں اُس سے رک جاؤ۔

اس آیت میں دو باتیں لائق توجہ ہیں۔ اول یہ کہ اس میں "ما" فرمایا گیا ہے جو عام ہونے کے اعتبار سے ہر اُس چیز کو شامل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو دیں خواہ وہ قرآن مجید ہو یا ارشادات نبوی، ہمارا فرض ہے کہ اُس کو قبول کرلیں اور پھر جس چیز سے آپ روکیں اُس سے رک جائیں۔

(باقی)